پروفیسر شیر محمد گریوال

اکبری الحاد اور اس کا ردِّ عمل

اسلام ایک انقلاب، ایک تحریک، ایک تہذیب اور ایک تمدن ہے۔ یہ تمام دنیا کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ اس کے بنیادی عقائد اور اساسی اصول ہمیشہ عقلِ سلیم رکھنے والوں کے لیے قابلِ عمل اور قابلِ قبول رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ تیرہ چودہ صدیوں کے دوران میں یعنی آفتابِ اسلام طلوع ہونے کے کچھ مدت بعد سے، بعض عوامل، بعض افراد اور بعض تحریکوں کی طرف سے اسلام کی بنیادی تعلیمات اور بنیادی نظریات اور اس کی انفرادیت اور تشخص کو مسخ کرنے کی کئی دفعہ ناکام کوششیں کی گئیں۔ کبھی سبائی نظریات ابھرے اور اسلام کے مقدس پانی میں ایسا زہر گھول گئے جس کا تریاق کبھی نہ مل سکا۔ کبھی ثقفی کے نظریات کا پرچار ہوا جو اسلامی روح کو نقصان پہنچائے بغیر نہ رہ سکے۔ کبھی راوندیوں اور زندیقیوں نے عجیب و غریب خیالات اپنائے اور خدا تعالیٰ کی ذاتِ پاک ان کو منصور عباسی میں حلول کرتی ہوئی نظر آئی۔ کبھی معتزلہ نے "عقلیت" کا نعرہ لگا کر اسلامی عقائد کو فلسفیانہ مسائل کا گورکھ دھندا بنا دیا۔ کبھی قرامطہ نے مذہبی بے راہ روی اختیار کی جس کے تدارک کے لیے نہ جانے مسلمانوں کو خون کی کتنی ندیاں بہانا پڑیں۔ کبھی "شیخ الجبل" یعنی حسن بن صباح کا فتنہ اٹھا اور اس کے پیروکاروں یعنی فدائین نے نظام الملک طوسی ایسی مایۂ ناز شخصیتوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ الغرض کہیں فتنۂ ارتداد اٹھا۔ کہیں پیغمبری کے جھوٹے دعوے ہوئے۔ کہیں مہدیٔ موعود ہونے کے اعلان ہوئے۔ کہیں تصوف میں تجاوز سے کام لیا گیا اور کہیں ملتِ اسلامیہ کو وحدت الوجود اور وحدتِ ادیان کے راہبانہ اور فلسفیانہ عقائد میں الجھا دیا گیا۔ مختصر یہ کہ شروع ہی سے اسلام کو کفر، الحاد اور مذہبی بے راہ روی سے مسلسل واسطہ پڑا۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت و بقا کے لیے راسخ العقیدہ مسلمان حکمرانوں، اسلام کے جید عالموں اور صحیح العقیدہ مسلمان عوام کو ہمیشہ ثابت قدم رکھا جنھوں

نے الحاد اور گمراہی کے ہر فتنہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

صدیوں کی تاریخِ اصلاح و احیائے دین اس بات کی شاہد ہے کہ مصلحین و مجددین اسلام کا کام اس وقت اتنا مشکل نہیں ہوتا تھا جب فتنۂ ارتداد و الحاد غیر مسلم پیدا کرتے تھے لیکن جس وقت الحاد، آزاد خیالی اور مذہبی بے راہ روی کا کوئی فتنہ اسلام کے نام سے اٹھایا جاتا تھا یعنی جب فتنہ اٹھانے والے ایک طرف تو خود کو مسلمان گردانتے تھے اور دوسری طرف اسلامی روح کے منافی الٹے سیدھے خیالات کی تبلیغ اور مذہب کی لادینی تعبیروں کا اظہار کرتے تھے تو مصلحین و مجددین کی مشکلات میں بہت اضافہ ہو جاتا تھا۔ جلال الدین اکبر کا دور جو اس تمہید کا محرک بنا ہے، ایسے ہی نازک صورتِ حال کا مظہر ہے۔ ایک طرف تو اکبر اور اس کے حواری یعنی شیخ مبارک، اس کے بیٹے ابوالفضل اور فیضی اور اسی قبیل کے دوسرے لوگ اپنے آپ کو شاید بہت بڑے مجتہد عالم سمجھتے تھے اور دوسری طرف اس صاحبِ اقتدار ٹولے کی قیادت و سیادت میں اسلامی عقائد، اسلامی تعلیمات، اسلامی روایات اور اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ اکبر کے دربار میں نبوت، وحی، حشر و نشر، دوزخ و جنت کے متعلق اسلامی عقائد کا مذاق اڑایا گیا۔ قرآن کے کلام اللہ ہونے پر شبہ کیا گیا اور واقعۂ معراج کو ناممکن سمجھا گیا؛ لیکن ہندوانہ عقیدۂ تناسخ پر ایمان لایا گیا۔ رسول پاکؐ کی ذات پر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے اور آپ کی شادیوں کو نشانۂ تنقید بنایا گیا۔ اور ناموں کے ساتھ محمد اور احمد کے الفاظ ترک کیے جانے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اعلانِ معصومیت یا محضر نامہ کے ذریعہ اُن پڑھ اکبر، امام عادل اور امام مجتہد بن بیٹھا۔ ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی گئی، جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ : یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اکبر اس کا خلیفہ ہے۔ گویا اسلامی عقیدۂ رسالت کی جگہ خلافتِ اکبری نے لے لی ـــــ اس نئے مذہب کے طریقوں اور رسوم کے مطابق مریدوں یا چیلوں کو روزانہ بادشاہ یعنی اکبر کا درشن کرنا ہوتا تھا۔ نئے مذہب میں داخل ہوتے ہوئے سابقہ مذہب کو چھوڑنا اور جان، مال، عزت سب کچھ نئے مذہب پر قربان کرنا ہوتا تھا۔ درشن کے ساتھ بادشاہ کو سجدہ کرنا بھی لازمی تھا۔ سلام کرنے کا اسلامی

طریقہ بھی بدل دیا گیا۔ اکبری چیلے جب ایک دوسرے سے ملتے تو ایک، اللہ اکبر کہتا اور دوسرا اس کے جواب میں جل جلالہٗ کہتا۔ اس سے اللہ کے نام کی عظمت اور شان کا اظہار کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا بلکہ جلال الدین اکبر کے نام کی عزت افزائی کرنا اصل مقصد تھا۔ سورج کی پرستش بھی اس مذہب کے رسوم میں شامل کی گئی اور ہر روز آفتاب کے نام ایک ہزار مرتبہ جپے جاتے تھے۔ سورج کے احترام میں مشرق کی طرف پاؤں کرکے سونا اس مذہب میں ناجائز تھا۔ لیکن مغرب، یعنی خانۂ کعبہ کی طرف پاؤں کرکے سونے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ بانی مذہب یعنی اکبر، خانۂ کعبہ کی طرف پاؤں کرکے ضرور سوتا تھا۔ ریشمی لباس اور سونے کا استعمال جائز قرار دیا گیا۔ بیاہ شادی اور مُردوں کو دفنانے کے اسلامی عقائد بدل دیے گئے۔ مُردوں کو جلایا یا دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ شاہی محل میں ناقوس بجائے جاتے اور آگ روشن کی جاتی۔ مگر نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی۔ گائے کا گوشت حرام قرار دیا گیا اور شیر اور بھیڑیے کا گوشت حلال ہو گیا۔ سور کو مقدس جانور سمجھا جانے لگا۔ سود، جوا، شراب، سب حلال قرار دیے گئے۔ ایرانی تہوار نوروز اور ہندو تہوار دیوالی، دسہرا اور راکھی وغیرہ بڑے اہتمام سے منائے جانے لگے۔ داڑھیاں منڈوانے کا رواج زیادہ ہو گیا۔ اسلامی طریقۂ تعلیم سے بھی نفرت کی جانے لگی اور فقہ، حدیث اور عربی زبان کی تعلیم ناپسندیدہ ہو گئی۔

ان سب باتوں کی نشاندہی سب سے زیادہ ایک ہم عصر مؤرخ ملّا عبد القادر بدایونی نے کی ہے۔ بعض مؤرخوں اور تبصرہ نگاروں نے بدایونی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ اکبر سے دشمنی کی بنا پر لکھا ہے اور اکبر کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دینِ الٰہی کو جاری کرنا اور ہندوؤں، پارسیوں اور جینیوں کے عقائد کو اپنانا جھوٹ ہے؟ اگر بدایونی کا بیان غلط ہے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ان تحریروں کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے جو اسی ابھرتے ہوئے الحاد اور مذہبی بے راہ روی کے بارے میں ہیں؟ بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر سو فیصدی ٹھیک نہیں تو اسّی فیصدی ضرور صحیح ہے۔ بدایونی کا قصور یہ ہے کہ وہ راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا اور اس نے جو دیکھا لکھ دیا۔

اس مذہبی بے راہ روی کے متعلق جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اور حضرت مجدد الف ثانی کی تحریروں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی روشنی میں ہم اکبر اور اس کے حواریوں کے "مسلمان ہونے" کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر پیدا ہوا تو مسلمان تھا۔ مرا تو مسلمان تھا۔ بلکہ وہ تو اس وقت بھی اپنے آپ کو بے دین نہیں سمجھتا تھا جب اس نے نام نہاد دینِ الٰہی جاری کیا اور تمام اسلامی تعلیمات کے خلاف اقدام کرنے لگا۔ اور عبداللہ ازبک کے نام خط میں جو غالباً ۱۵۸۶ میں لکھا گیا تھا وہ ترکِ اسلام کے الزام سے انکاری ہے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کو کوئی مشورہ ایسا نہیں دیا جو اسلام کے خلاف ہو۔ بلکہ وہ تو نعتیں لکھتے رہے۔ قرآن شریف کی بے نقط تفسیر لکھی۔ اپنی تحریروں سے پہلے بسم اللہ لکھتے تھے۔ لہٰذا یہ سب چیزیں ثبوت ہیں اس بات کا کہ وہ صحیح مسلمان تھے۔ اوّل تو یہ طرزِ استدلال غلط ہے۔ اور دوسرے یہ سوال بھی تو اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر انھوں نے اکبر کو کوئی مشورہ ایسا نہیں دیا جو اسلام کے خلاف تھا تو کیا انھوں نے اس کو ایسے نظریات اپنانے یا پھیلانے سے روکا جو اسلام کے خلاف تھے؟ علاء الدین خلجی بھی ایک نئے دین کے اجرا کا خیال رکھتا تھا لیکن علاء الملک ایسے درباریوں نے اسے روک دیا تھا۔ کیا ایسا کوئی قدم ابوالفضل اور فیضی نے بھی اٹھایا تھا۔ ایک زمانہ ساز عالم کے زمانہ ساز بیٹے اس قسم کا اقدام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ جتنا اکبر اسلام سے دور جا چکا تھا اتنا ہی اس کے حواری بھی اس کے ساتھ گئے اور جتنا نقصان اکبر نے اسلام اور مسلمانوں کو پہنچایا اتنا ہی اس کے حواریوں نے بھی پہنچایا۔

دینِ الٰہی کی ساری عمارت "صلح کل پالیسی" کی بنیاد پر اٹھائی گئی تھی۔ صلح کل پالیسی سے مراد غالباً یہ تھی کہ برعظیم کی تمام قوموں، تمام فرقوں اور تمام لوگوں سے دوستی پیدا کر کے اقتدار کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ یہ نظریہ فی الواقع غلط نہیں تھا۔ لیکن اکبر اپنی اس پالیسی میں توازن پیدا نہ کر سکا۔ وہ دوسرے مذاہب اور دوسری اقوام کی ہر طریقہ سے دلجوئی کرنے لگا لیکن اسلام اور مسلمانوں سے بے اعتنائی برتی۔ اس نے ہندوؤں، پارسیوں اور عیسائیوں کو تو سینہ سے لگایا لیکن راسخ العقیدہ مسلمان علما اور امرا سے نفرت کرنے لگا۔ دوسرے

مذاہب خاص کر ہندو مت کے عقائد کی پذیرائی ہوئی لیکن اسلامی عقائد اور ارکان پر پابندی لگا دی گئی۔ ہندوؤں، خاص کر ہندو راجپوتوں کو بڑے بڑے منصب اور عہدے دیے جانے لگے اور مسلمان امرا کو پس پشت ڈال دیا گیا۔

ہندو راجپوتوں کو منصب عطا کرنا اور بڑے بڑے عہدے دینا، ان کے ساتھ رشتہ داریاں قائم کرنا اور ان پر ٹیکس معاف کر دینا، یہ سارے اقدامات تاریخ میں اکبر کی راجپوت حکمتِ عملی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ حکمتِ عملی صلح کل پالیسی کا بنیادی پتھر تھی اور اس کا اصل محرک اکبر کا یہ نظریہ تھا کہ چونکہ راجپوت اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں اس لیے ان کے ساتھ تصادم کی پالیسی ختم کرکے ان سے دوستی کی جائے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف تو مسلمان امرا کی طاقت کم کر دی جائے اور دوسری طرف ملکی استحکام حاصل کیا جائے۔ لیکن اکبر کا یہ خیال بالکل غلط تھا۔ راجپوت اتنی صلاحیتوں کے مالک نہیں تھے جتنا کہ اکبر سمجھتا تھا۔ سب سے بڑی صلاحیت شاید اکبر کے نزدیک یہی تھی کہ راجپوت بہادر اور شجاع تھے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان جرنیلوں نے ایک دفعہ نہیں بلکہ بیسیوں دفعہ ہندوؤں اور راجپوتوں کی بہادری اور شجاعت کا پول کھول ڈالا تھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ میں راجہ داہر کی بہادری کا پول کھول دیا۔ محمود غزنوی نے پنجاب، ملتان، سندھ، گجرات اور راجپوتانہ کے میدانوں اور ریگستانوں میں راجپوت راجاؤں اور سورماؤں کو متواتر شکستیں دیں۔ محمد غوری ترائن کی دوسری لڑائی میں راجپوتوں پر فتح یاب ہوا۔ علاء الدین خلجی نے راجپوتوں کے چتوڑ، رن تھمبور اور دیوگڑھ جیسے ناقابلِ تسخیر قلعوں کو فتح کر لیا اور ظہیر الدین بابر نے رانا سانگا ایسے "راجپوتِ اعظم" کے قومی تکبر کو کنواہہ کے میدان میں ملیامیٹ کر دیا۔ فنِ حرب میں راجپوت جرنیل مسلمان جرنیلوں کی طرح ماہر نہ تھے اور اپنی تمام جنگی روایات کے باوجود وہ دفاعی اصولوں سے ناواقف تھے۔

اگرچہ راجپوت جرنیلوں نے اکبری فتوحات میں کافی حصہ لیا، لیکن اکبری دور کی تمام تر کامیابیوں کا سہرا راجپوتوں کے سر باندھ دینا قطعاً درست نہیں۔ کسی مہم میں کوئی راجپوت جرنیل اکیلا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک دو مسلمان جرنیل ضرور ہوتے تھے۔

اکبر کا یہ خیال تھا کہ راجپوتوں سے دوستی کرکے وہ تصادم کو ختم کر دے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔

جن راجپوتوں نے تصادم کی پالیسی اختیار کی تھی، انھوں نے اس کو جاری رکھا۔ رانا پرتاب اور رانا اودے سنگھ اکبر سے مسلسل برسرپیکار رہے اور وہی راجپوت اکبر کے ساتھ رہے جو پہلے ہی مطیع ہو چکے تھے۔ اکبر سے پہلے علاء الدین خلجی اور شیر شاہ سوری نے بااثر ہندوؤں سے نباہ کیا ہی تھا۔ مگر انھوں نے رواداری کے نام پر غلط پالیسی اختیار کر کے اپنے مذہب کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جبکہ اکبر تمام حدود کو پھلانگ گیا اور اس نے راجپوت حکمت عملی اختیار کر کے نہ صرف مسلمانوں کو نقصان پہنچایا بلکہ اپنے جانشینوں کے لیے بھی مشکلات پیدا کر دیں۔ ایک مبصر کے الفاظ میں راجپوت فائدے کی بجائے بوجھ ثابت ہوئے۔ وہ راجپوت جو راجپوتانہ کے پہاڑی قلعوں سے کبھی باہر نہیں نکلے تھے اور جنھیں راجپوتانہ کے باہر کوئی نہ جانتا تھا اور نہ جان سکتا تھا اب وہ ہندوستان کی مرکزی سیاست میں سرگرم تھے۔ ان کو بڑے بڑے صوبوں کی گورنریاں مل رہی تھیں۔ اب وہ عالمی شہرت کے مالک بن گئے تھے۔ اور لامحالہ اپنے آپ کو ایک بہت بڑی طاقت سمجھنے لگے تھے۔ ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے بغیر اب ملک کا کاروبار سلطنت نہیں چل سکتا تھا اور یہ احساس تکبر اور گھمنڈ کافی حد تک بڑھ چکا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی عام ہندو رعایا بھی متکبر ہونے لگی۔ اور آگے چل کر ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف پر پرزے نکالنے شروع کیے۔

اکبر کے دربار میں اعلیٰ ہندو عہدے دار اور رانیاں مسلمان امرا اور علما کا اثر و رسوخ ختم کرنے میں کوشاں تھے اور ٹوڈرمل ایسے ہندو عہدیدار مسلمانوں کے سلسلے میں انتہائی تعصب کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ اکبر کے دور میں ہونے والی تمام زرعی اصلاحات کا سہرا ٹوڈرمل کے سر باندھ دیا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت مسلمان ماہرین مالیات کی خدمات ٹوڈرمل سے کہیں زیادہ ہیں۔ شہاب الدین، مظفر تربتی، فتح اللہ گیلانی اور سب سے بڑھ کر خواجہ شاہ منصور کا اکبری دور میں نظام مالیہ درست کرنے میں سب سے زیادہ حصہ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ٹوڈرمل خواجہ شاہ منصور سے دشمنی رکھتا تھا اور جب بھی موقع ملتا اس کے خلاف اکبر کے سامنے زہر اگلتا رہتا۔ آخر کار خواجہ منصور، ٹوڈرمل کی سازشوں کا شکار ہو گیا اور ناحق حکم شاہی سے قتل کیا گیا۔

ملک کے انتظامی، سیاسی اور مذہبی امور میں علما اور مشائخ کو جو مرتبہ حاصل تھا اکبر اس سے بے خبر نہیں تھا اور وہ ان کے اثر سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہندو رانیاں اور آزاد خیال لوگ علما کے خلاف اکبر کے کان بھرنے لگے۔ شیخ مبارک، اس کے دونوں بیٹے فیضی اور ابوالفضل اکبر کے بہت نزدیک ہو گئے تھے۔ شیخ مبارک بہت پڑھا لکھا تھا۔ لیکن مذہبی عقائد میں پختگی نہ تھی اور راسخ العقیدہ مسلمان علما اسے پسند نہ کرتے تھے۔ فیضی اور ابوالفضل کی علمیت سے انکار نہیں، لیکن باپ کی طرح ان میں بھی مذہبی پختگی نہ تھی اور وہ مذہبی آزاد خیالی کے علمبردار تھے۔ ان سب نے مل کر اکبر کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ وہ امام عادل اور امام مجتہد ہے۔ اس سلسلے میں ایک محضر نامہ بھی تیار کر لیا گیا جسے شیخ مبارک نے ترتیب دیا تھا۔ بات اصولاً غلط نہ تھی۔ اسلامی آئین میں سربراہِ مملکت کا امام عادل اور امام مجتہد ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ آئینی اصطلاحیں خلفائے راشدینؓ کے علاوہ عمر بن عبدالعزیزؒ ایسے حکمرانوں پر عائد ہوتی تھیں۔ اکبر جیسا اَن پڑھ اور علومِ شریعتِ اسلامیہ سے بے خبر خود سر حکمران امام عادل یا امام مجتہد کہے جانے کا ہرگز مستحق نہ تھا۔

۱۵۷۵ء میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ کی بنیاد رکھی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر علمی بحثوں کا شوقین تھا اور عبادت خانہ کی تعمیر اسی شوق کا نتیجہ تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ اپنے علمی شوق میں مخلص تھا تو اسے بہت پہلے یہ اقدام کرنا چاہیے تھا۔ وہ ۱۵۶۲ء سے با اختیار حکمران تھا۔ ۱۵۷۵ء میں علما کی بحثیں سننے کے لیے کیوں مضطرب ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ علما سے اتنی جلدی اُکتا کیوں گیا۔ عبادت خانہ بحث مباحثے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اور بحث مباحثے میں تلخ کلامی کی نوبت آسکتی ہے اور ایک دوسرے پر ذاتی حملے بھی ہو سکتے ہیں۔ عبادت خانہ میں بھی یہ سب کچھ ممکن تھا اور ہوا۔ جس سے اکبر نے خوب فائدہ اٹھایا۔ دراصل عبادت خانہ ایک ڈرامائی اسٹیج تھا جو خاص مقصد سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اکبر ۱۵۷۵ء تک کئی شاندار فتوحات حاصل کر چکا تھا اور گجرات جیسے زرخیز صوبے اس کے قبضہ میں آگئے تھے۔ فتوحات، دولت اور بیٹوں کی پیدائش نے اس کے نشۂ قوت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ علما تھے، جن سے نجات حاصل کرنے کی دو صورتیں تھیں۔ یا تو اکبر علما سے قریب

ہوکر ان کو اپنے ساتھ چلاتا یا ان کو آپس میں لڑا کر ان کو بدنام اور کمزور کر دیتا۔ اور یہی مقصد پورا کرنے کے لیے عبادت خانہ تعمیر کیا گیا۔ اکبر ایک طرف تو علما کو لڑانے اور انھیں کمزور کرنے میں کامیاب ہوا اور دوسری طرف وہ امام عادل اور مجتہد اعظم بننے کے بعد ایک نئے حلقۂ ارادت یا مذہب یعنی نام نہاد دینِ الٰہی کا بانی بھی بن گیا۔

"دینِ الٰہی" کا اجرا اکبر کے بدلتے ہوئے مذہبی رجحانات کا نقطۂ عروج تھا۔ اور اس کی وجہ سے نہ صرف دربار میں بلکہ سارے ملک میں الحاد، آزاد خیالی اور مذہبی بے راہ روی پھیل رہی تھی۔ مکتوباتِ مجدد الف ثانیؒ اس بات کی ایک مستند تاریخی شہادت ہیں

اس پُر آشوب زمانے میں اکبری الحاد کے ساتھ ساتھ بھگتی تحریک جیسے عناصر بھی مذہبی بے راہ روی اور سیاسی انتشار پیدا کر رہے تھے۔ دربار کے اندر اور باہر سبھی جگہ الحاد، آزاد خیالی اور گمراہی پھیل رہی تھی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ ہندو اس صورتِ حال سے بہت خوش تھے۔ ہندو وزیر اور دوسرے عہدے دار بہت چالاک تھے۔ اکبر ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ اکبر کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال کا ایک اور خطرناک پہلو یہ تھا کہ اکبری دربار سے تعلق رکھنے والے ہندو عہدیداروں کے خفیہ تعلقات "بھگتی تحریک" والوں سے تھے۔ جو مسلمان حکمرانوں کے انتہائی مخالف تھے اور ان کی تحریک اسلام کے تشخص اور انفرادیت کے لیے ایک زبردست خطرہ تھی۔ بنارس اور متھرا اس تحریک کے بڑے بڑے مرکز تھے جو صدیوں سے ہندو مت کے گڑھ بنے ہوئے تھے۔

اکبر شاید اس صورتِ حال کو نہیں سمجھ سکا تھا اور "صلح کل پالیسی" کی بنیاد پر "جگت گورو" بننے کے خوابوں میں محو رہا اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے زبردست خطرات پیدا کرتا رہا۔ اس صورتِ حال کو اکبر اور اس کے حاشیہ نشین تو برداشت کر سکتے تھے لیکن راسخ العقیدہ مسلمان علما، امرا اور عوام کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ اس کا زبردست ردِ عمل ہوا۔ جو ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور اس کے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔

اکبر کی مذہبی اور سیاسی بے اعتدالیوں کے خلاف سب سے پہلے اکبر کے دربار ہی سے

شدید مخالفت کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں شیخ الاسلام مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبد النبی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اور ان کو اس بات کا دکھ تھا کہ اکبر، شیخ مبارک اور اس کے بیٹے ابو الفضل اور فیضی الحاد کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں نے محضر نامہ پر جس کی رو سے اکبر کو امامِ عادل اور امام مجتہد گردانا گیا تھا، دستخط کیے تھے اور اس لحاظ سے یہ بھی شیخ مبارک وغیرہ کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر کئی تبصرہ نگاروں نے ان دونوں کو بھی شیخ مبارک وغیرہ کے ساتھ علمائے سُو کی صف میں کھڑا کیا ہے، جو خلافِ انصاف ہے۔ کیونکہ انھوں نے خوشی سے نہیں بلکہ دباؤ کے تحت دستخط کیے تھے۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھیں جرأت سے کام لے کر محضر نامہ کو ٹھکرا دینا اور "جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے" کی سعادت حاصل کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ایسی سعادت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ سعادت امام احمد بن حنبلؒ کو نصیب ہو سکتی ہے یا ابنِ تیمیہؒ کو یا مجدد الف ثانیؒ کو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ ان عظیم شخصیتوں کے ہم پلہ نہیں تھے۔ تاہم محضر پر دستخط کرنے کے باوجود انھوں نے آگے چل کر اکبری جسارت کے خلاف مخالفانہ رویہ اختیار کیا اور اس جہاد میں عملی حصہ بھی لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں بہت بڑے عالم دین تھے اور ان کے دشمنوں نے ان کے متعلق بہت سی بے اصل باتیں گھڑ رکھی تھیں جس کو مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ نے مزید ہوا دی اور آج بھی ہماری درس گاہوں میں یہ فضول قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ تمام کمزوریوں کے باوجود ان دونوں کے بارے میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور انھوں نے اکبر کی آزاد خیالی و مذہبی بے راہ روی کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ اکبر ان کی مخالفت برداشت نہ کر سکا اور دونوں کو زبردستی مکّہ معظمہ روانہ کر دیا اور تا حکمِ ثانی ان کی واپسی پر پابندی لگا دی۔ یہ اس دور کا عام رواج تھا کہ جب کبھی حکمرانوں کو کسی امیر سپہ سالار یا عالم سے کسی قسم کا خطرہ ہوتا تھا تو اسے زبردستی حج پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اکبر کی بے راہ روی کے

خلاف جب مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی اور دو بڑے صوبوں، کابل اور بنگال میں بغاوتیں ہوگئیں تو مخدوم الملک اور عبدالنبی نے موقعہ کو غنیمت سمجھا اور اکبر سے اجازت لیے بغیر وطن واپس آگئے۔ لیکن ان کے پہنچنے تک اکبر بغاوتوں پر قابو پاچکا تھا اور ان دونوں کی دربار میں طلبی ہوئی۔ مخدوم الملک تو دربار تک پہنچنے سے پہلے ہی مرگیا یا زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ مروا دیا گیا اور عبدالنبی دربار میں حاضر ہوا۔ اکبر اور عبدالنبی کے درمیان سخت کلامی ہوئی جس کے نتیجے میں عبدالنبی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

دربار سے منسلک کئی راسخ العقیدہ مسلمان امرا نے بھی اس موقع پر جرأت و بہادری کا ثبوت دیا۔ ان میں سے ایک مرزا عزیز کوکہ بھی تھا۔ وہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اکبر اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اسے امیر الامرا کے خطاب سے نوازا تھا۔ لیکن وہ اکبر کے مذہبی نظریات کا مخالف تھا۔ اور اسی وجہ سے گجرات جیسے اہم صوبے کی گورنری کو چھوڑ کر مکہ روانہ ہوگیا اور اکبر کے نام ایک یادداشت لکھی، جس میں اس کی مذہبی بے راہ روی کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ دوسرے امرا میں شہباز خان کمبوہ اور قلیچ خان گورنر لاہور نے بھی اکبر کے مذہبی خیالات کی زبردست مخالفت کی۔ عبدالرحیم خان خانان نے بھی راسخ العقیدہ مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ سب سے زیادہ مثبت کردار سید مرتضیٰ خان نے ادا کیا جو شیخ فرید کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بخشی کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج میں ہم خیال لوگوں کو بھرتی کیا اور احیائے دین کی تحریک کی ہر جگہ حمایت کی۔ شیخ فرید حضرت باقی باللہ کا مرید تھا اور حضرت مجدد الف ثانی اسی شیخ فرید کو اکبری الحاد کے خلاف خطوط لکھا کرتے تھے۔

اکبر کے دربار کے باہر جن لوگوں نے اکبری الحاد کی ڈٹ کر مخالفت کی ان میں زیادہ قابل ذکر محمد یزدی جونپوری ہیں۔ وہ مذہباً شیعہ اور جونپور کے قاضی تھے۔ اکبر کے بڑھتے ہوئے الحاد کو وہ برداشت نہ کرسکے۔ اور انھوں نے اکبر کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ اکبر کافر تھا یا نہیں، یہ ایک علاحدہ مسئلہ ہے، یہاں دو پہلو قابل غور ہیں۔ ایک تو قاضی کی جرأت، کیونکہ اکبر جیسے مطلق العنان حکمران کے خلاف کفر کا فتویٰ دینا کوئی معمولی اقدام نہ تھا۔

جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے دربار میں تہلکہ مچ گیا تھا اور اکبر کے لیے صورتِ حال بہت سنگین ہوگئی تھی۔ دوسرے یہ کہ قاضی مذہباً شیعہ تھا اور قاضی کا یہ زبردست اقدام اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اکبری الحاد کا مقابلہ شیعہ اور سنی دونوں مل کر کر رہے تھے۔ ویسے بھی مغلوں کے سارے دور میں شیعہ اور سُنّی متحد نظر آتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ حکمران سنی تھا اور اس کی ملکہ شیعہ یا حکمران سُنّی تھا اور اس کا وزیر شیعہ یا باپ سُنّی تھا اور بیٹا شیعہ۔ لیکن کیا مجال کہ اس دور میں کوئی شیعہ سُنّی اختلاف ہوا ہو۔ بنگال کے قاضی معزالملک بھی اکبر کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ محمد یزدی اور معزالملک گرفتار کر لیے گئے اور ان دونوں کو دریا میں ڈبو دیا گیا۔ ملک کے باقی حصوں میں بھی علما کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی اور خاص کر پنجاب کے علما کو چن چن کر قتل کیا گیا۔

جن نامور علما نے اکبر کے الحاد کی مخالفت اور احیائے دین کے سلسلے میں شاندار کردار ادا کیا ان میں خواجہ باقی باللہ، شیخ عبدالحق محدّث دہلوی، شیخ جمال الدین اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدّث پہلے اکبر آباد (آگرہ) میں رہتے تھے۔ لیکن اکبری دربار میں مذہبی بے راہ روی کو دیکھ کر دہلی چلے آئے اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے اسلام کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ یہی حال شیخ جمال الدین کا تھا۔ انھوں نے محضر نامے پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور آگرہ سے بطور احتجاج چلے آئے تھے۔ حضرت باقی باللہ نے زیادہ ٹھوس بنیادوں پر کام کیا۔ انھوں نے دربار سے تعلقات منقطع کرنے کی بجائے قائم رکھے۔ اور شیخ فرید ایسے امرا کو الحاد اور آزاد خیالی کے خلاف ابھارتے رہے۔ لیکن افسوس کہ انھیں بہت تھوڑا عرصہ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ لیکن ان کے کام کو حضرت مجدد الف ثانی نے نہ صرف جاری رکھا بلکہ اسے احیائے دین کی ایک مکمل تحریک کی شکل دے دی۔ مجدد الف ثانی کے کام پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان کے کارنامے ایک مجدد کے کارنامے ہیں۔ وہ ہر جگہ اور ہر حالت میں نہایت منظم طریقے پر تقریر و تحریر اور عمل سے اکبری الحاد کی بیخ کنی کرتے رہے اور اس فتنے کو کچل دینے میں کامیاب ہوئے۔

مختصر یہ کہ اکبری دور میں الحاد، آزاد خیالی اور بے راہ روی کا جو طوفان اٹھا تھا اس کے سامنے راسخ العقیدہ مسلمان علما، امرا اور عوام ایک آہنی دیوار بن گئے۔ اور ان کے ردِعمل سے جو تحریک عمل میں آئی اس سے ایک طرف تو احیائے دین کا اہتمام ہوا اور دوسری طرف مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں نئی جان پڑ گئی۔ مسلم مملکت دو گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک راسخ العقیدہ گروہ اور دوسرا آزاد خیال گروہ۔ شہزادہ سلیم یعنی جہانگیر کی تخت نشینی کے موقعہ پر دونوں گروہ متصادم ہوئے اور راسخ العقیدہ گروہ اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شاہ جہان کے آخر دور میں تخت نشینی کے لیے جنگ دراصل انھیں دو گروہوں یا نظریات کی جنگ تھی اور ساموگڑھ کے میدان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شاندار فتح دراصل راسخ العقیدہ مسلمان امرا، علما اور عوام کی فتح تھی اور آزاد خیالی کے علمبردار دارا شکوہ کی شکست الحاد اور مذہبی بے راہ روی کے حامی گروہ کی مکمل شکست تھی۔

اسلام اور مذاہبِ عالم

از محمد مظہرالدین صدیقی

یہ مذاہبِ عالم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام انسان کے مذہبی ارتقا کی فیصلہ کن منزل ہے اور اس نے خدا پرست مذاہب کے حقائق کو یک جا کر کے اپنی وحدت میں سمو لیا ہے۔

صفحات : ۲۸۲ قیمت : ۸/- روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور